Chapter- 2

باب دوم

۱۔ اجتہاد فکر و نظر

۲۔ سر سید احمد خان سے عقیدت

۳۔ شخصیت اور کردار

۴۔ اخلاق و خصائل

باب دوّم

۱. اجتہادِ فکر و نظر :

مولانا آزاد کا خاندان بالخصوص ان کے والد، عقائد و افکار میں ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اپنے اس مسلک کے عقائد میں سر مو انحراف بھی گوارا نہیں کرتے تھے بلکہ اسے کفر سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے مولانا آزاد کو مغربی تعلیم سے دور رکھا۔ یہاں تک کہ انہیں مشرقی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی کسی مدرسے میں بھیجنا گوارہ نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے گھر پر ہی اپنے والد کی نگرانی میں انتہائی سخت ماحول میں تعلیم حاصل کی۔ جو اساتذہ انہیں درس دیتے تھے ،ان کے عقائد و افکار اور نظریات کو پہلے ہی سے ان کے والد جانچ پرکھ لیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مولانا آزاد کا ذہنی دریچہ اس طرح بند ہوگیا کہ باہر سے آنے والی تازہ ہوا کے کسی جھونکے کے گذرنے کا امکان ہی نہیں رہا اور دوسری طرف ان کے گھر کے سخت قدامت پرست ماحول نے انہیں گھر سے باہر بھی کہیں جانے نہیں دیا۔ ان کے گھر میں عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ جو لوگ رہتے تھے وہ اس خاندان کے مرید اور معتقد تھے۔ ان مریدین و معتقدین سے اپنی زبردست بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے مولانا آزاد خود فرماتے ہیں۔

”میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔۔۔ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری طرف لے جارہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔“(۱)

اپنے گھر کے قدامت پرست ماحول سے گھٹن، مریدوں کی عقیدت مندانہ پرستاریوں سے بیزاری اور اپنی طبیعت کی قدرتی افتاد نے مولانا آزاد کے دل میں اپنے خاندانی موروثی عقائد سے نفرت پیدا کردی اور ان کی بے چین طبیعت بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ اپنے دل کی چبھن کا

---

(۱) غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) مرتبہ مالک رام (ص۔ ۸۲)

اظہار کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہوگیا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہئے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے چنی تھیں، بہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں اور پھر وقت آیا کہ اس ہلتی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔" (۲)

مختلف علوم، خصوصاً فلسفے کے مطالعے نے مولانا آزاد کے موروثی عقائد کو متزلزل کر دیا اور انہوں نے عقائد وافکار کی وہ تمام دیواریں ڈھا دیں جس پر ان کی خاندانی تقلید پرستی کی عمارت کھڑی تھی اور اس کی جگہ حقیقی عظمت کی نئی دیواریں چننا شروع کردیں۔ ان کے نزدیک سچی عظمت وہ ہے جو انسان خود اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد خود تحریر فرماتے ہیں۔

"پس سچی عظمت کی راہ یہ نہیں ہے کہ فریڈرک کی عظمت یافتہ تلوار لوگوں کو دکھلائیں۔ سچی عظمت وہ ہے، جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو۔ ہم کو اپنے نیام میں صرف اپنی ہی جوہر تلوار رکھنی چاہیے۔ دوسروں کی تلواروں کی نمائش سے اگر دیکھنے والوں کا تعجب و احترام حاصل کر بھی لیا گیا تو اس کے اصلی مالک ہم نہیں ہیں، تلوار کا مالک ہے۔" (۳)

مولانا آزاد نے اپنے غائر مطالعے اور مشاہدے سے حقیقی عظمت کو پہچان لیا تھا۔ انہوں نے موروثی عقائد کے جمود و تعطل کو توڑ دیا اور تقلیدی ایمان کی پٹیاں آنکھوں سے کھول کر سچی عظمت کا سراغ پا لیا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں۔ ہم اس راہ کا سراغ نہیں پا سکتے۔ لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری چشم بند تھی، جس نے عین روشنی میں گم

(۲) غبار خاطر از ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام (ص۔ص ۔ ۱۰۰ ۔ ۹۹)

(۳) انتخاب تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی (ص۔ ۵۳)

کر دیا تھا۔" (۴)

مولانا آزادؔ کی چشم بند کھل گئی اور وہ تقلید پرستی کے اندھیروں سے باہر نکل آئے۔ اپنے خاندان کی قدامت پرستی، سر سید احمد خان کے اثرات اور فلسفے سے دلچسپی کی وجہ سے ان کی فکر ساری بندشوں سے آزاد ہوگئی۔ ان کی فکر و نظر کی تبدیلی پر روشنی ڈالتے ہوئے سید مسیح الحسن یوں رقمطراز ہیں۔

"تقریباً ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء تک مولانا عقائد سلف پر قائم رہے لیکن جوں جوں مطالعے اور واقفیت کی وسعتیں بڑھتی گئیں، ارد گرد کے ماحول سے بیزاری شروع ہوگئی اور عہد اضطراب و پریشانی کا آغاز ہوا۔ ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر یعنی ۱۹۰۱ء سے شک و شبہات کے میدان خار زار میں قدم رکھا۔ اس کے بعد لامذہبیت، مٹریل ازم، ریشنلزم، کفرو الحاد، فسق وفجور غرض یہ کہ بے راہ روی کے مختلف مدارج طے کرتے چلے گئے۔ بالآخر ۲۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ اچانک امید کی روشنی سامنے آئی اور منزل مقصود تک رسائی ہوگئی۔" (۵)

درسگاہ الٰہی کا دروازہ کھلنے کے بعد موروثی عقائد نے مولانا آزادؔ کے دل میں چبھن پیدا کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تشکیک و اضطراب نے ان کی روح کو بے چین کردیا۔ وہ کچھ دنوں کے لئے بھٹک گئے اور حقیقت کی جستجو میں لگ گئے۔ ابتدا میں سر سید احمد خان کی عقلیت پسندی سے متاثر ضرور ہوئے لیکن بہت جلد وہ ان کی تقلیدی روش سے بھی کنارہ کش ہوگئے۔ ان کے شکوک و کاوش کی وسعتوں میں مزید اضافہ ہوگیا اور وہ وہم و گمان، فسق و فجور، تشکیک و اضطراب اور کفر والحاد کی مختلف منزلوں سے بھٹکتے ہوئے بالآخر یقین و اعتقاد کی منزل تک پہنچ گئے۔ ان کی فکر و نظر میں نمایاں تبدیلی آگئی اور انہوں نے تقلید پرستی کے برخلاف ہمیشہ کے لئے اجتہاد کا راستہ اپنالیا۔

۲۔ سر سید احمد خان سے عقیدت:

مولانا آزادؔ کو شروعات میں سب سے زیادہ سر سید احمد خان کی کتابوں اور ان کے خیالات نے متاثر کیا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ سے سر سید احمد خان کی تمام کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ بڑے

(۴) غبار خاطر (ابوالکلام آزادؔ) مرتبہ مالک رام (ص ص ۴۰۔ ۳۹)

(۵) حواشی ابوالکلام آزادؔ۔ مرتب مسیح الحسن (ص۔ ۲۸)

شوق سے کیا تھا۔ مطالعہ تصانیفِ سرسید کے اثرات کو مولانا آزاد نے ان لفظوں میں واضح کیا ہے۔

"سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کرلی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح، جو اپنے شیخ و مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے، ان کی تصنیفات کا ہر ورق و صحفہ میں نے نہایت جدوجہد کر کے حاصل کیا۔" (۱)

مولانا آزاد نے اپنے رسالے "لسان الصدق" میں بھی علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کئی بار کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سرسید احمد خان سے بے حد متاثر تھے۔ان کی تحریروں نے مولانا آزاد کے انداز فکر و نظر کو یکسر بدل دیا اور انہیں تقلید پرستی کے جامد پنجوں سے چھڑایا ور ایسی راہ دکھائی جس نے انہیں منزل تک پہنچانے میں مشعل راہ کا کام انجام دیا۔

سرسید احمد خان جدید ایجوکیشن کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان علوم جدیدہ پر دسترس حاصل کر کے گورنمنٹ سے وہ تمام حقوق حاصل کرسکتے ہیں جس کے وہ واقعی مستحق ہیں۔ان کے نزدیک جدید ایجوکیشن وہ چیز ہے، جو انسانوں کے موجودہ مسائل کو حل کرنے کی زبردست طاقت رکھتی ہے۔ مولانا آزاد کو سرسید احمد خان کے انہی خیالات نے بے حد متاثر کیا تھا۔ان سے اپنی عقیدت اور علوم جدیدہ کی اہمیت و افادیت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"سرسید کی تصنیفات کے مطالعہ نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا بلکہ شائق و گرویدہ بنا دیا تھا۔ اب وہ حال تھا کہ عقائد و افکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔" (۲)

حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد خان کے افکار و خیالات نے مولانا آزاد کے ذہن کو نئی جلا بخشی اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں وہ بنیادی پتھر رکھا جس پر بعد میں ان کی فکر و عمل

---

(۱) آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی (ص ص ۔ ۲۵۱ ۔ ۲۵۰)

(۲) حواشی ابوالکلام آزاد ۔ سید مسیح الحسن (ص ۔ ۴۲)

کا محل بلندیوں کو چھونے لگا اور انہوں نے سرسید احمد خان کی طرح اپنے عہد کی روح کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔دراصل مولانا آزاد کی فکر، فکر سرسید کی ایک ارتقائی منزل ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ پہلی منزل سے گذرے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو مصلحت کے تحت سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہا تھا، تاکہ مسلمان اپنی تمام تر توجہ مغربی علوم کے حصول میں لگادیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی اس پالیسی کے غلط اثرات مترتب ہوئے اور مسلمانوں کا وہ مزاج بن گیا جو سرسید احمد خان کا مقصد ہر گز نہیں تھا۔ بقول رشید احمد صدیقی۔

"سرسید کے اس "فرسٹ ایڈ" کو ان کے بعد آنے والوں نے خود غرضی یا ناسمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمہ صحت۔" (۳)

چنانچہ مسلمان میدان سیاست سے دور رہے اور ہندوؤں نے مغربی تعلیم حاصل کرکے حکومت سے اعلیٰ عہدے حاصل کرلئے اور ان میں قومی بیداری بھی پیدا ہوگئی، نتیجے کے طور پر وہ عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر فرنگیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست خلیج حائل کردی اور دونوں قومیں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگیں۔مولانا آزاد نے اس تشویش ناک صورتحال کا بغور جائزہ لیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید احمد خان سے انتہائی عقیدت کے باوجود ان کے مذہبی مسلک اور عقلیت پسندی سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ خود مولانا آزاد نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

"ابتدائی زمانہ وہ تھا کہ قدیم خیالات و عقائد سے دل برداشتہ ہو چکا تھا اور سرسید مرحوم کی تعلیمات نے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن زیادہ دنوں تک طبیعت اس پر قانع نہیں رہ سکی ،جیسا کہ ہمیشہ ان حالات میں پیش آیا ہے۔ سرسید کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہوگئی اور جو دروازہ انہوں نے کھول دیا تھا اس نے بالآخر شک و اضطراب کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحادوانکار تک پہنچا دیا۔" (۴)

مولانا آزاد سیاسی میدان میں فکر سرسید سے الگ ہوتے چلے گئے۔ سرسید احمد خان سے ان کے اختلاف کا یہی وہ پہلو ہے جسے بہت اچھالا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید اور ان کے

---

(۳) آج کل۔ مولانا آزاد نمبر۔ نومبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات۔ خلیق احمد نظامی (ص۔ ۶۱)

(۴) آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی (ص ۔ ۲۷۷)

جدید افکار و خیالات ہی مولانا آزاد کو سیاسی میدان میں کھینچ لانے کے محرک بنے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے قومی اور وطنی نظریات کی تاریخی بنیاد سر سید احمد خان کے افکار وخیالات ہی ہیں۔ سر سید اور مولانا آزاد کے انداز فکر میں بہت مماثلت تھی۔ دونوں مسلمانوں کی نجات کے لئے جدید علوم کے حامی تھے۔ دونوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مذہب میں اجتہاد سے کام لیا جائے، تاکہ مذہب اسلام، مسلمانوں کی مادی ترقی اور روحانیت کا موجب بنے۔ مولانا آزاد کو سر سید احمد خان سے کوئی اختلاف تھا تو صرف یہ کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے اور مسلمانوں کو اپنی مادی ترقی کے لئے حکومت کے تعاون پر آمادہ کرتے تھے جبکہ مولانا آزاد انگریزوں کے شدید مخالف تھے۔ سر سید کے سیاسی و فکری نظریات سے انہوں نے اسی بنا پر انحراف کیا تھا۔ اس کے بارے میں مولانا آزاد خود فرماتے ہیں۔

"میں سر سید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں، مگر ساتھ ساتھ یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ وہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے۔ انہوں نے ملک کے لئے شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔" (۵)

مولانا آزاد کو سر سید احمد خان سے اخیر عمر تک بے پناہ عقیدت قائم رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے سر سید احمد خان کی بعض پالیسیوں سے اس حد تک مخالفت کی تھی کہ لوگ انہیں سر سید احمد خان کے زبردست مخالفین میں شمار کرتے تھے۔ مولانا آزاد علامہ شبلی کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کا شمار نابغہ روزگار میں کرتے تھے اس کے باوجود وہ فرماتے ہیں۔ "مولانا شبلی کی ساری دماغی تربیت سر سید کی وجہ سے ہوئی۔" (۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کو سر سید احمد خان سے بہت عقیدت تھی اور ان کا سر سید احمد خان سے اختلاف صرف نظریاتی تھا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں جن عظیم دانشوروں اور مفکروں سے فیضان حاصل کیا تھا ان میں سر سید احمد خان کا نام سر فہرست آتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا آزاد نے ضروری ترمیم و تنسیخ کے ساتھ سر سید احمد خان کے عظیم مشن کی بڑی حد تک تکمیل کی۔ وہ اپنے شعور کی ابتدا کے ساتھ ہی سر سید احمد خان کے بتائے

---

(۵) برہان (سہ ماہی) دہلی ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء (ص۔ ۲۰)

(۶) آج کل (دہلی) مولانا آزاد نمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد پر سر سید کے اثرات۔ خلیق احمد نظامی (ص۔ ۶۳)

ہوئے راستے پر چلے لیکن بعد میں انہوں نے سر سید مرحوم سے اپنے انتہائی احترام و عقیدت کے باوجود چند فکری اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر اپنی راہ خود نکالی لیکن یہ راستہ بھی یقیناً وہی راستہ تھا جس کی نشاندہی سر سید احمد خان نے کی تھی، جس پر چل کر مولانا آزاد نے فکروارتقاء کے مختلف منازل و مراحل طے کئے۔

۳. شخصیت اور کرادر:

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت طرازی میں قدرت نے غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا۔ پروفیسر محمود الہٰی ان کی پہلودار شخصیت کے نقوش پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"حریت پسندی، نظم و انضباط، بے خوف و بے ریائی، صحت مند عقلیت، اجتہاد فکر و نظر اور تقلید و تصنع سے بیزای، مولانا آزاد کی شخصیت کے نقوش ہیں اور یہ نقوش جب مثبت انانیت سے کسب نور کے بعد ابھرتے ہیں تو ان کی کشش اور بڑھ جاتی ہے۔" (۱)

مولانا آزاد اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے ایک دل پذیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اور وہ ذہانت کی خداداد دولت سے مالا مال تھے۔ علامہ شبلی انہیں عمر رسیدہ بزرگ سمجھتے تھے۔ ان کی ذہانت و فطانت کو دیکھ کر خواجہ الطاف حسین حالی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے ان کی ذہنی تیز رفتاری سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ آزاد کی عمر پیدائش کے وقت پچاس برس کی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو مولانا آزاد سے بہت قریب تھے۔وہ لکھتے ہیں۔

"اُن کی (مولانا آزاد کی) یادداشت حیران کن ہے اور مختلف مضامین پر ان کی معلومات قاموسی ہے۔ وہ جدید خیالات کے بہت سے رجحانات سے خاصے واقف ہیں۔ ڈھیروں کتابیں پڑھتے ہیں۔ قرون وسطیٰ بالخصوص عالم عرب، مغربی ایشیا اور مسلم عہد کے بھارت پر ان کی دسترس گہری ہے۔ افلاطون اور ارسطو ان کی نوک زبان پر ہیں۔" (۲)

مولانا آزاد کی اسی ذہانت، عقل و تدبّر، معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے صرف پینتیس سال کی عمر میں انہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چنا گیا۔ان کی شخصیت میں بے پناہ جاذبیت تھی۔ انہیں دیکھتے ہی احترام کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ قبول صورت ہی نہیں بلکہ نہایت

---

(۱) الہلال کے تبصرے ۔ پروفیسر محمود الہٰی (ص۔ ۹)
(۲) ایوان اردو ۔ دہلی۔(مولاناابوالکلام آزاد نمبر) دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کا اخلاق و کردار ۔ میر شفقت علی وفا (ص۔۸۰)

حسین شکل و صورت کے مالک تھے۔ ان کی پوشاک کی تراش خراش اور ان کے ہر انداز و ادا سے نفاست ٹپکتی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان کے جاذب نظر سراپا کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگرٹ پیتے بر آمد ہوئے۔ گورے چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، جوانِ رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلو ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں۔" (۳)

خواجہ حسن نظامی نے مولانا کے قلمی چہرے کی تصویر یوں پیش کی ہے۔

"سر وقد، دوہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی داڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی و ظرافت۔" (۴)

درج بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد انتہائی وجیہہ و شکیل تھے۔ ان کی بلند و بالا شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی۔ وہ ہمیشہ سادگی کی زندگی کو پسند فرماتے تھے لیکن نفاست کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

مولانا آزاد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں سر سید احمد خان، جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ وغیرہ کا زبردست اثر تھا۔ وہ بھی ان عظیم شخصیتوں کی طرح ملک و ملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کافی غوروخوض کرنے کے بعد اپنا راستہ خود بنایا۔ ان کی شخصیت کئی اعتبار سے پہلودار، انوکھی اور متضاد تھی، بقول رشید حسن خان۔

"اپنی جامعیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے انوکھی، اپنی عادات و اطوار میں انوکھی' اپنے کردار اور تبحّر علمی میں انوکھی۔ لیکن اسی کے ساتھ تضاد کا پہلو وہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں ایک عالم دین متین "خام" سیاست کی کٹھن نشیب و فراز میں تگ ودو کرتا ہے۔۔۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تضاد تضاد نہ تھا بلکہ ایک مرکب پہلودار شخصیت کا تناؤ تھا۔"(۵)

مولانا آزاد کو خود اس تناؤ کا احساس تھا۔ مختلف متضاد صورتوں میں اعتدال قائم رکھنے میں

---

(۳) شاہراہ (ماہنامہ) دہلی (مولانا ابوالکلام آزاد نمبر) فروری۔ مارچ ۱۹۵۹ء (ص۔ ۹۷)
(۴) ایوان اردو۔ (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء قلمی فوٹو۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم (ص۔ ۱۴)
(۵) مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست، اور پیغام۔ رشید الدین خان (ص ص۔ ۱۸۔ ۱۶)

انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جیسا کہ ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"علم کی زندگی، سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک ہی وقت اور محل میں جمع ہونا بہت مشکل ہے۔ میری زندگی کی مشکلات میں پہلی مشکل یہ واقع ہوئی کہ میں نے چاہا کہ دونوں کو بیک وقت اور بیک محل جمع کردوں۔" (۶)

مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قول کو حیران کن حد تک سچ کر دکھایا۔ سیاسی سرگرمیاں ان کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہ ہوسکیں۔ ایک عالم دین کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست دان عام طور سے وقتی ہنگاموں اور باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی سنجیدگی، مزاجی توازن، سلجھی ہوئی قوت فیصلہ اور واقعیت پسندی سے ہر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جو ان کے ہم عصر دوست اور دشمن سب کے لئے حیرت انگیز بات تھی۔ بیک وقت دو متضاد صورتوں میں اس خوبصورتی سے ربط قائم رکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔وہ اپنی روشن دماغی سے مشکل سے مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور اپنے ناخن تدبیر سے کامیابی کا راستہ کھول دیتے تھے۔

مولانا آزاد کی جلیل القدر شخصیت میں قدرت نے حیرت انگیز کمالات ودیعت کردئے تھے۔ وہ ایک جادوبیان مقرر اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ آزادی کی جنگ میں جدوجہد کرنے والوں میں جتنے بھی بلند آہنگ خطیب تھے ان میں مولانا اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اعجاز بیان اور سحر خطابت سے بڑے سے بڑے مجمع کو مسحور کردیتے۔ آزادی سے قبل ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے بارش شروع ہوگئی۔ مولانا آزاد نے برجستہ اپنی تقریر کا رخ اس بارش کی طرف کیا اور یوں گویا ہوئے ۔

" آیئے! اب آسمان بھی ہمارا امتحان لینے لگا۔ لیکن جو آزادی کی آگ ہمارے سینوں میں بھڑک رہی ہے، بارش کے یہ معصوم قطرے اس آگ کو نہیں بجھا سکتے۔"(۷)

یہ جملہ سننے کے بعد مجمع اپنی جگہ پر ساکت و جامد بھیگتا رہا اور ہمہ تن گوش

---

(۶) مولانا ابوالکلام آزاد ۔ شخصیت ، سیاست اور پیغام ۔ رشید الدین خاں (ص ۔ ۱۸)

(۷) آواز (پندرہ روزہ) دہلی۔ یکم نومبر ۱۹۸۶ء (ص۔ ۶)

ہو گیا۔ درحقیقت مولانا آزاد کا انداز گفتگو مصلحت آمیز نہیں ہوتا تھا۔ انہیں کوئی غرض یا لالچ بھی نہیں تھی اسی لئے وہ اپنی بات نہایت بے باکی اور جرأت سے کرتے تھے۔ گاندھی جی بھی مولانا کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے اور بے لاگ بات کہتے تھے۔ ڈاکٹر بی۔ وی۔ کیسکر نے مولانا آزاد کی جادو بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میں نے آج تک کوئی ایسا مقرر نہیں دیکھا جس کی زبان میں مولانا کی زبان سے زیادہ مٹھاس ہو اور جس کو مولانا سے زیادہ قدرت زبان پر حاصل ہو۔ مجھے کئی بار ان کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں نے ہر بار یہی محسوس کیا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر بول رہے ہوں، زبان ان کی تابع ہوتی ہے۔ (۸)

مولانا آزاد عالم، صحافی، لیڈر اور وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا بھی تھے اور بہت بڑے اسکالر تھے۔ بیشتر علوم پر انہیں عبور حاصل تھا اور بڑی صفائی سے وہ اپنی بات کو پیش کرتے تھے۔ چراغ حسن حسرت ان کے علمی تبحر کاذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

"ایک مرتبہ پٹنہ میں بڑی دھوم سے کانفرنس ہوئی۔ غالباً حکیم مسیح الملک (اجمل خان) اس کے صدر تھے۔ چونکہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہیں (پٹنہ میں) موجود تھے۔ اس لئے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طب یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجئے۔ حکیم اجمل خان مرحوم نے بھی سفارش کی لیکن مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پورے دو گھنٹے طب قدیم اور طب جدید کے نظریوں اور طریق علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے۔ حکیم نثار احمد صاحب نے جو کلکتہ کے مشہور طب ہیں اور اس اجتماع میں موجود تھے، خود مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں۔" (۹)

درج بالا سطور مولانا آزاد کی انفرادی شان خطابت اور علمی نکتہ دانی کی بہترین مثال ہے۔ ان کی یہی شان انفرادیت انہیں دوسرے مقررین سے ممتاز بنا دیتی ہے۔

مولانا آزاد کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ شعر و ادب، خطابت، صحافت، موسیقی، مصوری

---

(۸) مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریک آزادی و یک جہتی۔ مرتبہ خان عبدالودود خان۔ ایک عظیم انسان۔ ڈاکٹر بی۔ وی۔ کیسکر (ص۔۲۵)

(۹) مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریک آزادی و یکجہتی۔ مرتبہ خان عبدالودود خان۔ عزت نفس کا مینار۔ چراغ حسن حسرت (ص۔۱۶)

اور دیگر فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں پر مہارت رکھتے تھے۔ ان کی جمالیاتی حس بہت بیدار تھی۔ ان کی زندگی اور ان کے مختلف علوم وفنون پر حسن و جمال کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ان کی شخصیت اور عملی زندگی دومتضاد عناصر سے مرکب تھی۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں ۔

"میں نے قید خانے کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جزرواقیہ کا ہے اور ایک لذتیہ کا۔۔۔جہاں تک حالات کی ناگواری کا تعلق ہے،رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن کو بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔ جہاں تک زندگی کی خوشیوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویہ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔" (۱۰)

مولانا آزاد پر اکثر الزام لگایا گیا کہ وہ مغرور اور کم آمیز ہیں لیکن درحقیقت ان پر یہ اتہام تھا۔ اگر وہ واقعی خشک مزاج اور روکھی پھیکی طبیعت کے مالک ہوتے تو ان کی تحریریں دل آویزی، نورونغمہ اور کیف و سرور سے عاری ہوتیں۔ غبار خاطر میں خود مولانا آزاد خوش مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہئے اور دوسروں سے بھی کہتے رہئے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔" (۱۱)

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کو مست و مبہوت بنادیا جسے سن کر لوگ آج بھی سر دھنتے ہیں۔ غبار خاطر کی شگفتہ تحریریں اور دیگر کئی ادبی شہ پارے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا بین ثبوت ہیں۔ مولانا آزاد زندگی کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے غبار خاطر میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔۔۔مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہد خشک اور طبع خشک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے

---

(۱۰) آثار ابوالکلام آزاد۔ (ایک نفسیاتی مطالعہ) قاضی عبدالغفار (ص۔ ۸۲)

(۱۱) غبار خاطر از ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام (ص۔ ۷۳)

ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دین داری اور ثقالت طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔۔۔آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلس طرب، تنگ دلوں کے گوشہ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہوتی ہے۔۔۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاش فطرت کے مو قلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرا، ستاروں کی چمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں آپ ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح اپنی جگہ نکل سکتی ہو۔"(۱۲)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تحریر مولانا آزاد نے احمد نگر جیل میں ایام قید کے دوران لکھی تھی۔ مولانا کی اس تحریر سے ان کے مزاج کی شگفتگی اور اعلیٰ ظرفی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی شخصیت میں بے پناہ سنجیدگی، استقامت، اعتدال، توازن' انکساری اور نرمی تھی۔ لوگوں کی گستاخیوں اور بیہودگیوں کو وہ کشادہ دلی سے معاف کردیتے اور ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ بھی روا رکھتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے دہلی میں ۲۳، فروری ۱۹۵۸ء کو ایک تعزیتی جلسے میں ان کی شخصیت اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اقرار کیا تھا۔

"میں ان سے (مولانا آزاد سے) دور دور رہتا تھا۔ اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا۔ کبھی کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ ابھی سال بھر سے کم عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان سے کچھ کھچا۔ اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کھچاوٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا، مگر اس کوہ وقار نے بجائے اس کے کہ

---

(۱۲) غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) مرتبہ مالک رام (ص۔ ۷۶)

اسے میری گستاخی سمجھے، مجھ پر محبت کی بھرمار کی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے ابلے جاتے تھے۔" (۱۳)

مولانا آزاد بڑے خلیق اور ملنسار تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اپنے رفقاء، عزیزوں اور شاگردوں کے ساتھ شفقت، محبت اور انکساری سے کام لیا۔ انھوں نے میدان سیاست میں بھی کئی جھگڑوں کو سلجھایا۔ اپنے قریبی لوگوں کو ہمنوا بنانے میں اکثر و بیشتر کامیابی حاصل کی۔ جہاں کہیں وہ ناکام ہوئے وہاں بھی انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا منظور کرلیا اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ جس سے ان کے کسی ساتھی کے عزت نفس اور وقار کو ٹھیس پہنچے۔

علی گڈھ والوں نے مولانا آزاد کے خلاف زبردست ہنگامہ کھڑا کردیا تھا اور انہیں طرح طرح کی دماغی اذیتیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن اس نفس قدسیہ نے برے وقت میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے مسائل کو نہ صرف حل کیا بلکہ اس کو رواں دواں کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن ان کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کے باوجود انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستانی قومیت کی حمایت میں انھوں نے جتنا ظلم و جور اپنے ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں اٹھایا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے مسلمان رہنما کے حصے میں آیا ہو۔

مولانا آزاد کی دل پذیر شخصیت مصیبت کے دنوں میں اور نکھر جاتی۔ تنگ دستی اور ذہنی اذیتوں کے دور میں ان کی طبیعت کی بشاشت اور شگفتگی حیرت انگیز طور پر عروج پر پہنچ جاتی۔ ان کے قریبی دوست عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں۔

"مولانا نے جب آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نور نظر تھے۔ ہر طرف دولت بکھری ہوئی تھی۔ ایسے آدمی کے لئے تنگ دستی دوسروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس زمانے میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ ماتھے پر کبھی بل نہیں دیکھے۔ کبھی

(۱۳) ابوالکلام آزاد ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ۔ ابولکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (ص۔۲۵)

جھنجھلائے نہیں بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ (۱۴)

مولانا آزاد ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس میں انہیں طرح طرح کی مصیبتوں اور تنگدستی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ مالی اعتبار سے ہمیشہ پریشان رہے اور تنگدستی نے ان کا دامن کبھی نہیں چھوڑا کیونکہ انہیں روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سخی دل کے مالک تھے اور نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ دوسروں پر بھی دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے۔ ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے قرض لینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ جب مالی حالت بہتر ہوتی تو عمدہ سے عمدہ چیزیں استعمال کرتے اور شاہانہ ڈھنگ سے روپیہ خرچ کرتے اور جب مالی مصائب میں گرفتار ہوتے تو اپنی خود دار اور قناعت پسند طبیعت کا سہارا لیتے اور پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے۔ مولانا آزاد کی تنگ دستی کے دنوں کی داستان سناتے ہوئے عبدالرزاق ملیح آبادی یوں رقمطراز ہیں۔

"ارہر، مسور، مونگ کی ابالی دال اور پیچ نکلے چاول، بارہا یہی ہمارا دوپہر کا کھانا ہوتا تھا، امام الہند مولانا آزاد کا کھانا ہوتا تھا اور یہی وقت ہوتا تھا جب مولانا کی بے پناہ خطابت و ذہانت ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہوجاتی اور مولانا کی زبان بے روک ٹوک چل نکلتی تھی۔ طوفان پر طوفان اٹھاتی تھی۔۔۔ آخر کھانے کو نپٹانا ہی پڑتا تھا۔ اب مولانا کی فصاحت و بلاغت، ابالی دال اور بھات کے فضائل و مناقب کے بیان پر ایسی رواں دواں ہوجاتی کہ آدمی محوحیرت ہو کر رہ جائے۔ یہ دال سب دالوں سے افضل کیوں ہے۔ بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لئے نہیں، خود زندگی کے لئے بھی گارنٹی ہے۔ بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ کیوں تندرستی کے لئے خطرہ بن جاتی ہے؟۔۔۔ اس جلیل القدر انسان کی یہ تقریریں اس لئے ہوتی تھیں کہ اپنے رفیق طعام کو بہلائے رکھے اور احساس نہ ہونے دے کہ تنگدستی کی مجبوریاں گھیرے ہوئے ہیں۔ میں تو سب کچھ جانتا تھا، مگر انجان بنا رہتا تھا کہ مولانا کی بشاشت میں فرق نہ آنے پائے۔" (۱۵)

---

(۱۴) ابوالکلام آزاد ۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ مولانا آزاد فقروفاقہ میں ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی (ص۔ ۱۳۰)

(۱۵) ایضاً (ص۔ ۱۳۱)

مولانا آزاد اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے لیکن ان کی غیرت و حمیت اور خودداری انہیں دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے روکتی تھی۔ ان کی تنگدستی کا ذکر کرتے ہوئے "ترجمان القرآن" کے کاتب نے لکھا ہے۔

"ان دنوں جس کوٹھی میں مولانا قیام فرماتے تھے، اس کا کرایہ دوسو روپے ماہوار تھا۔ بالائی منزل پر خود مولانا رہتے تھے اور زیریں منزل، عمری بے (ایک ترک) کو ساٹھ روپے ماہوار پر دے رکھی تھی، جس میں ان کی کشمیری بیوی مع اپنے دو نوجوان لڑکوں کے رہتی تھی اور خود عمری بے اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر باہر رہتے تھے۔۔۔ ان سے جو کرایہ ماہوار وصول ہوتا تھا، وہ ذاتی ضرورتوں میں کام آجاتا تھا اور کوٹھی کا کرایہ ادا نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ اس زمانے میں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔" (۱۶)

مولانا آزاد کی شخصیت اور کردار کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی قوت برداشت مثالی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ہر تکلیف میں اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں اللہ کی مشیت ہوتی ہے اور اپنی اسی طبع خداداد کے بل بوتے پر وہ دنیا کے دکھ درد کو برداشت کر لیتے تھے اور اپنے مزاج کی شگفتگی وشادابی کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی (مرحوم) لکھتے ہیں۔

"بظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل ہیں۔" (۱۷)

مولانا آزاد نے جہاں شاہانہ شخصیت اور انداز فکر پایا تھا وہیں ان کے دل میں سماج کے پس ماندہ طبقوں، غریبوں اور عام لوگوں کے لئے بہت ہمدردی تھی ان کے پاس کوئی مال و دولت اور سرمایہ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے لیکن انہوں نے اپنے لئے کوئی ملکیت نہیں بنائی اور نہ روپیہ پیسہ اکٹھا کیا۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد قرض کی ادائیگی کے لئے ان کی ذاتی گاڑی بیچنی پڑی۔ اپنے پورے زمانۂ وزارت میں ان کے پاس صرف تین شیروانیاں تھیں جو پرانی ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔ اس کوہ

---

(۱۶) الجمعیۃ (روز نامہ) دہلی۔ آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۵۸ء (ص۔ ۲۲)

(۱۷) ایوان اردو۔ دہلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء قلمی فوٹو۔ خواجہ حسن نظامی (مرحوم) (ص۔ ۱۴)

علم و قار اور جلیل القدر شخصیت نے اپنے پیچھے صرف علم و دانش کا انمول خزانہ چھوڑا تھا۔

٤ . اخلاق و خصائل :

مولانا آزاد کی شخصیت جامع الصفات اور جامع الکمالات تھی۔ ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت حیران کن ہے۔ انہیں قدرتی طور پر علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔ ان کی طبیعت کا بے مثل خاصہ یہ تھا کہ جس علم کی طرف توجہ کرتے اس کو از ابتدا تا انتہا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ تفتیش، کھوج اور جستجو ان کا فطری ذوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تیرہ چودہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے فقہ، حدیث، منطق اور ادبیات وغیرہ پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے علم نجوم، علم جفر اور علم رمل کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور موسیقی سے بھی انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا ہادی رسوآ سے اس فن کو باقاعدہ سیکھا تھا۔

مولانا آزاد ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کے ہزاروں عقیدت مند مرید تھے۔ ماڈی دولت کی انہیں کوئی کمی نہ تھی۔ دینی اور دنیوی علوم سے بھی انہیں قدرت نے نوازا تھا۔ ان کے والد کے مریدوں کا ایک حلقہ ہمیشہ مولانا آزاد کی پرستش کے لئے منتظر رہتا تھا۔ ایسے حالات میں ان میں احساس برتری اور انانیت کا پیدا ہو جانا عین فطرت کے مطابق تھا لیکن مولانا آزاد کے اخلاق و خصائل کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ غرور و تکبر کا شائبہ بھی ان کی زندگی میں نہیں تھا۔ البتہ وہ مزاجاً کم آمیز ضرور تھے جس کا اعتراف خود انہوں نے بھی کیا ہے۔

مولانا آزاد کے بارے میں ایک عام تصور یہ قائم کرلیا گیا ہے وہ ایک خشک مزاج، مغرور، کم آمیز اور کم بولنے والے انسان تھے۔ عوام سے دور رہتے تھے اور اپنی خودساختہ دنیا میں اپنی سب سے اونچی جگہ پر براجمان تھے۔ نہ ہنستے تھے، نہ بولتے تھے، ہر وقت ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ مولانا آزاد سے متعلق یہ باتیں. جتنی مشہور ہیں اتنی ہی غلط اور بے بنیاد ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"ابوالکلام کی علمی و سیاسی شخصیت کے رنگ کچھ بھی ہوں، ان کے اندر جو انسان چھپا

بیٹھا ہے وہ نہاد وافتاد کے اعتبار سے عجیب ہے۔۔۔ شخصیت کی طرح ابوالکلام کی طبیعت کے بھی دو رنگ ہیں۔ اوّل ان کی طبیعت کا وہ نقشہ جو انہیں موروثی طور پر اپنے ابتدائی ماحول سے ملا اور دوسرا طبیعت کا وہ رنگ جو اکتساب اور ریاضت کے ذریعے کچھ نئے انداز میں نکھرا اور سنور کر چمکا۔ (۱)

درج بالا اقتباس مولانا آزاد کی متضاد طبیعت کی ترجمانی کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ مولانا کو خشک مزاج اور بد دماغ کہنا ان پر سراسر بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی عوامی جدوجہد اور عام انسانوں کی خدمت میں گزار دی لیکن ان کی خلوت پسند طبیعت نے انہیں عوام سے الگ تھلگ رکھا۔ اس سلسلے میں خود مولانا آزاد اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"اس افتاد طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو سبک سر تصور کرتا ہوں۔ اس لئے ان کی طرف بڑھتا نہیں، حالانکہ مجھے اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔" (۲)

مولانا آزاد کی اس صراحت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی طبیعت کی افتاد انہیں عوام سے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ ان کے بیان سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان کی متضاد طبیعت میں خلوت پسندی کے باوجود غرور وتکبر بالکل نہیں تھا اور وہ مردم بیزار بھی نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی نے ان کے دل و دماغ کی اس متضاد کیفیت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا آزاد خود فرماتے ہیں۔

"میری طرف دیکھو، میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہاسال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کرتا رہا۔ میں صرف ایک ہی بات کی طرف تڑپ تڑپ کر پکار رہا تھا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں۔۔۔ تم نے ہمیشہ اعتراض کیا بلکہ غفلت اور انکار کی ساری سنتیں زندہ کردیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔

---

(۱) وجہی سے عبدالحق تک۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ (ص۔ ۴۳۳)

(۲) آثار ابوالکلام آزاد (ایک نفسیاتی مطالعہ) قاضی محمد عبدالغفار (ص۔ ۱۵۳)

HANSA MEHTA LIBRARY

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس ملک میں، میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔۔۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے، مجھے اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے سائے پر قانع رہنا پڑا۔ یہ عالم جو اپنے ہر گوشے میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے، میرے لئے ہمیشہ ایک صحرائے ریگ زار رہا کبھی اس نے ایک آبادی اور بستی کا کام نہیں دیا اور نہ میں کبھی اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں۔" (۳)

مولانا آزاؔد نے ہمیشہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا اور انہیں اس بات کا شدید دکھ بھی تھا۔ حالانکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ سیاست کی افراتفری میں گذرا تھا اور ہر ذہنی سطح کے افراد سے انہیں واسطہ پڑا تھا لیکن اپنی مخصوص افتاد طبع کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنہا ہی رہے۔ اپنے اس ذہنی کرب کو انہوں نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"میری راہ صاف نہیں ہے۔ نپولین کی طرح دماغ کا ایک خانہ نہیں۔ بیک وقت مجھے بہت سے خانے کھولنا پڑتے ہیں۔ مگر نتیجہ؟ سمجھنے والا کوئی ذہن نہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ تاریخ انسانی کا شاید سب سے زیادہ مظلوم وجود۔" (۴)

مولانا آزاؔد کو قدرت نے بے حساب ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا جیسا کہ ان کے مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا دماغ کسی عجائب خانہ سے کم نہیں تھا جس میں علم و دانش کے نادر موتی جابہ جا سجے ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی قدرت نے ان کی شخصیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ انہیں جلوت سے بیزاری اور خلوت سے لگاؤ تھا۔ اپنی اس افتاد طبع کے متعلق مولانا آزاؔد انکساری کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ عادتوں کی طرح پیدا نہیں ہوا بلکہ فطری ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جاسکتے۔ اس لئے بہ تکلف خود انجمن آرائیوں کا ذکر بننا پڑتا ہے مگر دل کی

---

(۳) آثار ابوالکلام آزاؔد (ایک نفسیاتی مطالعہ) قاضی محمد عبدالغفار (ص۔ ۱۶۳)

(۴) حواشی ابوالکلام آزاؔد۔ سید مسیح الحسن (ص۔ ۳۰)

طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ یوں ہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی۔" (۵)

کچھ تو مولانا کی افتاد طبع اس طرح واقع ہوئی تھی کہ انہیں تنہائی عزیز تھی اور کچھ انہیں اپنی زندگی میں اس قدر لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ اس حالت نے ان کی خلوت پسند طبیعت میں مزید اضافہ کردیا۔ غبار خاطر کے ایک مکتوب میں انہوں نے اپنی حد سے بڑھی ہوئی خلوت پسندی کا ذکر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جب کبھی میں قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لئے سزا کیسے ہوسکتی ہے۔ اگر دنیا اس کو سزا سمجھتی ہے تو کاش! ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے حاصل کی جائیں۔۔۔ ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہوگیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جاسکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان حضرت سے کہا۔ آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھینی جارہی ہے۔" (۶)

درحقیقت مولانا آزاد ہجوم سے گھبراتے تھے۔ سیاسی زندگی کے متعلق بھی وہ یہ کہتے تھے کہ یہ ہنگامے انہوں نے تلاش نہیں کئے بلکہ ان ہنگاموں نے خود انہیں تلاش کرلیا۔ مولانا کا یہ قول اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ان کے دل میں خدمت انسانیت کا ایک دریا موجزن تھا ورنہ وہ ان سیاسی ہنگاموں میں قطعی شریک نہیں ہوتے۔ نام و نمود، مال و دولت اور شہرت کی انہیں مطلق خواہش نہیں تھی، ورنہ وہ ہزاروں ہاتھ پاؤں چومنے والے معتقدین سے دامن چھڑا کر اس خارزار وادی میں ہرگز قدم نہ رکھتے۔ جہاں تک ان کی خلوت پسند طبیعت کا تعلق ہے، مولانا خود اسے ایک نقص سمجھتے تھے کہ آدمی خلوت اور تنہائی میں راحت محسوس کرے لیکن وہ مجبور تھے۔ بقول خود "اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اسے توڑا تو جاسکتا ہے مگر موڑا نہیں جا سکتا

---

(۵) غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) مرتبہ مالک رام (ص۔ ۸۱)

(۶) ایضاً (ص۔ ص۔ ۸۴ ۔ ۸۳)

۔"(۷)

مولانا آزادؔ پابندیٔ اوقات کے معاملے میں بھی.اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی زندگی میں اصولوں کی تنظیم و ترتیب اور اصولوں کے پاس و لحاظ کی نادر مثالیں ملتی ہیں۔ اصول و ضوابط کی پابندی میں وہ انگریزوں سے بڑھ کر تھے۔ ان کے ہاں ہر بات کا اصول اور ہر کام بندھے ٹکے اوقات میں ہوتا تھا۔ ان سے قریبی تعلقات رکھنے والے لوگ جانتے تھے کہ مولانا کس وقت کیا کررہے ہونگے۔ بلا اجازت اور پیشگی وقت لئے بغیر کوئی ان سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔

مولانا آزادؔ مسلسل چائے اور سگریٹ کے عادی تھے۔ وہ چائے کے بہت رسیا تھے اور خود چائے بنانے میں ماہر بھی تھے۔ چینی چائے "وائٹ جیمس" انھیں بہت مرغوب تھی۔ مولانا پیار سے اس چائے کو "گوری چنبیلی" کہا کرتے تھے۔ وہ بغیر دودھ کی چائے پیتے تھے۔ غبار خاطر میں انہوں نے چائے کی لذت کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے جو انتہائی دلچسپ بھی ہے اور اپنی جگہ ادب پارے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ چائے نہ پینے والے کو مولانا آزادؔ بدذوق کہتے تھے۔ چائے نوشی اور چائے تیار کرنے کے معاملے میں بھی ان کا ذوق و اہتمام بہت بلند تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیتا ہوں۔۔۔ یہ وقت میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پر کیف وقت ہوتا ہے۔ لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لئے ہوئے اٹھے اور قرینے سے چائے بنا کر میرے سامنے دھرے۔ اس لئے خود ہی اپنے دست شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشے کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز کی دہنی طرف جگہ دونگا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھئے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا جاتا ہوگا جو چائے کے اس دور صبح گاہی کا ہر

(۷)غبار خاطر (ابوالکلام آزادؔ)مرتبہ مالک رام(ص۔۷۹)

گھونٹ میرے لئے مہیا کردیتا ہے۔" (۸)

مولانا آزاد چائے کے ساتھ ساتھ سگرٹ بھی بہت پیتے تھے۔ انہیں "چین سموکر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی سگرٹ نوشی کا انداز بھی بڑا نرالا اور عجب تھا۔ وہ سگرٹ کو اپنے انگوٹھے اور پہلی انگلی کے درمیان لے کر آہستہ آہستہ گھماتے رہتے اور کش بھی لگاتے رہتے، جس کی وجہ سے انہیں سگرٹ کی راکھ گرانے کے لئے جھٹکا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں گاندھی جی کے سامنے صرف مولانا آزاد سگرٹ کے کش پر کش لگاتے اور راکھ جا بہ جا بکھر جاتی۔

عام خیال ہے کہ سگرٹ کا عادی سگرٹ کو بڑی مشکل ہی سے چھوڑ پاتا ہے لیکن مولانا آزاد کا آہنی عزم اس معاملے میں مثالی تھا۔ جب انہیں ۱۹۲۱ء میں گھر سے گرفتار کیا گیا تو میز پر پڑے ہوئے سگرٹ کیس پر ان کی نظر پڑی۔ حسب عادت انہوں نے سگرٹ کیس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر روک لیا۔ پولس کمشنر نے مولانا آزاد کی اس ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا اور اصرار کیا کہ وہ سگرٹ کیس لے لیں اور مولانا نے اٹھا لیا۔ اس میں دس سگرٹ تھے۔ جیل کے دفتر پہنچنے تک انہوں نے اس میں سے دو سگرٹ پئے اور دو ساتھیوں کو پلا دئے، بقیہ جیلر کے حوالے کر دئے۔ مولانا آزاد دو سال تک قید میں رہے لیکن جیل کے اصولوں کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے اس طویل مدت میں ایک بھی سگرٹ نہیں پیا۔ حالانکہ انہیں غیر قانونی طور پر سگرٹ مل سکتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ قید کی مدت گذارنے کے بعد جب انہیں رہائی ملی تو جیل سپرنٹنڈنٹ نے تواضع کی غرض سے مولانا آزاد کو سگرٹ پیش کیا اور انہوں نے لے لیا۔ غبار خاطر میں اس واقعے کو انہوں نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"جس دن علی الصبح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانے کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور ازراہ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجئے جس درجے کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگرٹ ترک کیا تھا، اتنے ہی درجے کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول کرلی۔ نہ ترک کرنے میں دیر لگی، نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا، نہ حصول پر نشاط ہوا۔

---

(۸) غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) مرتبہ مالک رام (ص ص۔ ۷۱۔ ۷۰)

ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا، وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا۔" (۹)

مولانا آزاد پان نہیں کھاتے تھے لیکن جب کھانے پر آجاتے تو ہر پانچ سات منٹ میں گلوری منہ میں ہوتی تھی اور تمباکو بھی ڈھیر بھر ڈالتے تھے۔ وہ بغیر تمباکو کے پان کو گناہ بے لذت سمجھتے تھے اور مذاق سلیم کے ساتھ سنگین جرم گردانتے تھے۔

مولانا آزاد تشکیک و اضطراب میں مبتلا ہو کر کچھ وقت کے لئے راہ حق سے بھٹک گئے تھے جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے۔ ان کی چند عارضی لغزشوں اور فطری کمزوریوں کو لے کر مولویوں اور عالموں کا طبقہ ان سے بہت ناراض رہتا تھا کیونکہ یہ طبقہ سادہ زندگی گذارنے کو تقویٰ سمجھتا تھا۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے "الہلال" لوگوں میں بہت مقبول ہوا اور ان کی شہرت کا پورے ملک میں ڈنکا بج گیا۔ ان حالات میں مولویوں اور عالموں کا طبقہ بالخصوص سید سلیمان ندوی اور ان کے ہم خیال صحافی مولانا آزاد سے حسد میں مبتلا ہوگئے۔ انہوں نے مولانا کو بہت بدنام کیا۔ اس سلسلے میں عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا آزاد سے سید سلیمان ندوی کے حسد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خدا ان صاحب کی مغفرت کرے۔۔۔ دور اول الہلال میں ملازم تھے، پھر اتفاق زمانہ اور اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے بڑا نام پیدا کیا۔ نام آوری نے مولانا(آزاد) سے حسد کی آگ دل میں لگا دی اور حسد نے بڑھتے بڑھتے جنون کی شکل اختیار کرلی اور مرحوم کس و ناکس حتیٰ کہ ان پڑھوں سے بھی مولانا کی برائی کرنے لگے۔" (۱۰)

"الہلال" کے زمانے میں مولانا آزاد کی گرفتاری ہوئی اور پریس ضبط کرلیا گیا۔ سید سلیمان ندوی اس وقت انہی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے اس خوف سے علیحدگی اختیار کرلی کہ شاید وہ بھی مولانا آزاد کے ساتھ گرفتار نہ ہوجائیں۔ مولانا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ان کی غیر محتاط زندگی کی روش کو پسند نہیں کرتے اس لئے ان کے ساتھ کام کرنا منظور نہیں ہے۔ مولانا آزاد مجسم اخلاق تھے۔ انہوں نے اپنی عارضی اخلاقی لغزشوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کو خط لکھا جو ان کے مثالی اخلاق

---

(۹) غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) مرتبہ مالک رام (ص ۔ ص ۱۸ ۔ ۱۷)

(۱۰) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء ۔ مولانا آزاد کا اخلاق و کردار۔ میر شفقت علی وفا (ص۔۸۱)

کا بین ثبوت ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

''برادر جلیل و اعز! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے خیالات ظاہر کر دیے اور اس کے بعد احسان مند ہوں اس احسان عظیم کے لئے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے اس خط کو میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لئے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ سچ ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں کچھ سچ بھی تھا۔۔۔ یہ تو آپ نے صحیح لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں لیکن میرے خیال سے یہ ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں ہے۔ ہاں اب ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے کہتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے سید سلیمان چلے گئے ہیں۔ میں نے جی میں کہا یہ تو سچ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط۔ میں شراب پیتا تھا اور شراب ہی پر کیا موقوف ہے، میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں۔ لیکن الحمد للہ کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔'' (۱۱)

درج بالا سطور سے مولانا آزاد کی نفسیاتی کیفیات اور ان کی صاف گوئی، کشادہ دلی، انکساری اور حساس طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وزارت تعلیم کے بلند و بالا اور معتبر درجے پر پہنچنے کے بعد بھی اپنے اخلاقی اوصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انہوں نے نہ صرف اپنے حریفوں کو معاف کردیا بلکہ ضرورت پڑنے پر ہر ممکن ان کی دستگیری بھی کی۔ ان کی انسان دوستی، دریا دلی اور منکسر المزاجی کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا آزاد کے بلند پایہ اخلاقی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جب دریا بادی (عبدالماجد دریا بادی) اور سید صاحب (مولانا سلیمان ندوی) کا حیدر آباد سے وظیفہ بند ہوگیا اور انہوں نے مولانا سے رجوع کیا تو اس ضمن میں مولانا نے بہت آسانی سے ان کا وظیفہ بحال کرا دیا۔ اس طرح پاکستان روپیہ بھیجنے پر جب سید صاحب کے خلاف انکوائری قائم ہوگئی، اگر مولانا اپنے رسوخ سے کام نہ لیتے تو نہ معلوم سید صاحب پر کیا بیتتی۔ یہی

(۱۱) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ مولانا آزاد کا اخلاق و کردار۔ میر شفقت علی وفا (ص۔۸۲)

نہیں پاکستان جانے پر سید صاحب کی حسب دل خواہ پذیرائی نہیں ہوئی، انہیں ہندوستان کی یاد ستانے لگی تو مولانا نے واپس آنے کے سب انتظام کرا دئے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔" (۱۲)

مولانا آزاد مسلمانوں اور خصوصاً قائداعظم محمد علی جناح کے طعن و تضحیک کا شکار ہوئے۔ محمد علی جناح نے انہیں کانگریس کا "شوبوائے" تک کہا لیکن مولانا صبر و تحمل سے ضبط کر گئے اور پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ انہوں نے قائد اعظم کے اس طعن پر کچھ کہا تو بس یہ کہ۔

"ہر شخص اپنے لب و لہجہ کا مختار ہوتا ہے۔ مسٹر جناح نے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔" (۱۳)

مولانا آزاد کی اخلاقی بلندی یہ ہے کہ انہوں نے جناح صاحب کو نہ صرف معاف کردیا بلکہ ان کے اعلیٰ کارناموں اور انتظامی صلاحیتوں کو بھی سراہا۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۸ء سے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا تو نہ جواب دونگا اور نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دونگا۔" (۱۴)

"ترجمان القرآن" کی اشاعت سے اہل حدیث کے علماء نے مولانا آزاد کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا، انہیں نازیبا کلمات کے تیرونشتر سے بڑی اذیت پہنچائی، لیکن ان سب باتوں کو بھی انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کرلیا اور کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ مولانا غلام رسول مہر جو مولانا آزاد سے بہت عقیدت اور محبت رکھتے تھے، انہوں نے مولانا سے اپنی مخالفتوں کا جواب دینے کے لئے کہا تو اس عظیم انسان نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ کوئی شخص خواہ کتنے ہی برے فعل کا مرتکب ہو، اسے برا نہیں کہنا چاہیے۔ اگر برا کہنا ہی ہے تو اپنے نفس کو برا کہنا چاہیے۔

ان تمام حالات و واقعات کی روشنی میں مولانا آزاد کے بلند اخلاقی اوصاف اور کردار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے یہ تمام واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ

---

(۱۲) ایوان اردو۔ (دہلی)۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کا اخلاق و کردار۔ میر شفقت علی وفا (ص۔ ۸۳)

(۱۳) مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریک آزادی و یکجہتی۔ مرتبہ خان عبدالودود خان (ص۔ ۲۸)

(۱۴) نقوش (آپ بیتی نمبر) جون ۱۹۶۴ء (ص۔ ۱۸۵۰)

ان کے پہلو میں ایک انتہائی درد مند دل تھا جس میں دوست دشمن سب کے لئے جگہ تھی اور جو سب سے بے پناہ محبت رکھتا تھا۔ ان کی شخصیت میں اعلیٰ کردار و عمل کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں۔ بلا شبہ مولانا آزاد ایک عظیم انسان تھے۔